لامتناعی بے اختیار اور بے بس تسلسل کے ساتھ وہ باتیں کرتی چلی جاتی یہ پرواہ کئے بغیر کہ دوسرے سرے پر اُسے کوئی سن بھی رہا ہے یا نہیں..

کبھی وہ کچھ کہنے کی کوشش کرتا تو وہ اٹکتی ہوئی رُک جاتی جیسے کسی نے اُسے ایک خواب میں ٹوک دیا ہو.. اور وہ چونک کر کہتی "جی سائیں؟"

جیسے وہ ایک بیان دے رہی ہو.. اقرار کر رہی ہو.. اور اُسے کچھ غرض نہ ہو کہ سامنے کون ہے.. وہ سن بھی رہا ہے یا نہیں... وہ بولتی چلی جاتی..

وہ کبھی یہ نہ کہتی کہ میں اپنے خاوند سے الگ ہونا چاہتی ہوں... میں اُسے ناپسند کرتی ہوں اور اُس سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی ہوں.. صرف یہی کوکتی اور بھرائی ہوئی ناآسودہ آواز میں کوکتی کہ... سائیں ہمیں بچالو..

جیسے اڈولف ہٹلر کے عہد میں آدھی رات کے وقت کسی یہودی کے دروازے پر دستک ہوتی تھی تو وہ جان جاتا تھا کہ اس لمحے یہ مرگ بلاواہی ہو سکتا ہے اور وہ خوفزدہ ہو جاتا تھا اسی طور اُس کا فون بھی ہمیشہ نصف شب کے بعد دستک دیتا اور وہ ڈر جاتا..

کبھی اُسے شک ہوتا کہ جو کچھ وہ بیان کرتی ہے وہ سکون آور گولیوں کے زیر اثر نیند اور اونگھ میں اپنے آپ سے ماورا ہو کر بیان کرتی ہے.. اور کبھی وہ اپنے آپ پر لعنت بھیجتا کہ اُس نے ایسا کیوں سوچا کہ اُس کی پکار میں دُکھ اور سچائی کے سوا کچھ نہ تھا.. کوئی فریب کوئی دھوکا نہ تھا..

لیکن ہمیشہ جب وہ رسیور اُٹھاتا تو اُس کے پہلے "ہیلو" کو سن کر وہ نارمل نہ رہتا' ڈر جاتا..

اُس "ہیلو" میں ایک گھسٹتا ہوا نشہ اور مرنے والے کی آخری سانس کا ہوکا ہوتا.. اُس کے اندر عابدہ سومرو کے لچکیلے وجود میں بہر طور کہیں نہ کہیں وہ سچائی تھی جو بعید از قیاس تھی.. ایک ایسے بھید میں پوشیدہ تھی جس کی تہہ تک وہ پہنچ نہیں پا رہا تھا..

عابدہ سومرو اور غلافی آنکھیں پہلو بہ پہلو چل رہی تھیں..

آنکھوں کو علم تھا کہ وہ بھی رقیب ہے پر وہ اُس کی آمد سے دمکتی تھی' بجھتی نہ تھی.. اور عابدہ اپنے درد و چھوڑے کا حال اتنے تسلسل کے ساتھ بیان کرتی تھی کہ اُس میں غلافی آنکھوں کی موجودگی کا اقرار کرنا ممکن نہ تھا..

وہ اپنی غلافی آنکھوں سمیت اُس کی حیات کے کھیت میں آنسو بہاتی تھی اور عابدہ لاپرواہ ایک ٹیلی فون لائن پر سسکتی اپنے دُکھڑے بیان کرتی تھی..

"تم اُس سے ملو... وہ ایک دکھی عورت ہے.. اُس کے لئے کچھ کرو.. جو وہ کہتی ہے وہ کرو... وہ میری ہمزاد ہے"... نہ رقابت اور نہ جلن... وہ عابدہ کو جتنا بھی جانتا تھا اُسے بہر حال یہ احساس ضرور ہو گیا تھا کہ وہ کسی اور عورت کے حوالے پر بھڑک بھی سکتی ہے.. بھک سے اُڑ سکتی ہے اور کچھ بعید نہ تھا کہ تشدد پر بھی اُتر آئے کیونکہ اُس میں کچھ علامتیں تھیں.. لیکن غلافی آنکھوں میں کچھ بھی نہ تھا نہ رقابت نہ جلن!

عابدہ سومرو باقاعدگی سے اُسکے ساتھ رابطہ نہ رکھتی تھی' کئی کئی دن اُدھر سے خاموشی رہتی اور پھر یکدم وہ نصف شب کے بعد ٹیلی فون پر نمودار ہو جاتی.. ایک طویل وقفے کے بعد گئی رات اُس کا فون آگیا..

"ہیلو..." وہی بھاری نیند میں ڈوبی نشہ آور آواز "سائیں آپ سو تو نہیں گئے تھے؟"

"نہیں..... بہت دنوں کے بعد فون کر رہی ہو... کیسی ہو؟"

"شہلا آفریدی از ڈیڈ.... سائیں شہلا مر گئی ہے.." اُس نے صرف اتنا کہا اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگی "وہ میری بہترین دوست تھی سائیں.. وہ مر گئی سائیں مر گئی..." اور پھر اُس کی ہچکیاں بندھ گئیں اور وہ بول نہ پائی.. بچوں کی طرح بلکتی رہی..

ہمدردی اور اُس کے لئے دُکھ کے آثار خاور کے ماتھے کی سلوٹوں میں نمایاں ہونے لگے.. اُس پر اتنا اثر ہوا کہ جواب میں فوری طور پر کچھ بھی نہ کہہ سکا.. اور کہنے کو بھی کچھ نہ تھا وہ شہلا آفریدی سے واقف ہی نہ تھا اور نہ یہ اس کے علم میں تھا کہ وہ اُس کی بہترین دوست تھی.. وہ سوائے خدا بخش اور بابا سائیں کے اپنے کسی قرابت دار کسی دوست کے بارے میں کبھی کچھ نہ کہتی' اپنی بیٹی کے بارے میں بھی صرف اُس کے استفسار پر کچھ بتا دیتی... اُس نے عابدہ کو پر سکون کرنے کے لئے اپنے تئیں بہترین لفظوں کا چناؤ کیا... اُس کے غم میں کسی حد تک شریک ہونے کا اقرار کیا لیکن وہ نہیں سن رہی تھی' صرف ہچکیاں لے رہی تھی اور درمیان میں یکدم اونچی آواز میں رونے لگتی..

خاور بستر سے اُٹھا اور ٹیلی فون تھامے ہوئے سامنے صوفے پر جا بیٹھا..

"یہ کیسے ہوا عابدہ؟"

"میں ذمے دار ہوں خاور.. میں کلپرٹ ہوں اُسے میں نے ہلاک کیا ہے.." وہ شاید اپنے بال نوچ رہی تھی کہ اُس کے رونے میں یکدم اذیت کی کوئی سسکی بھی در آتی.. وہ بین کرتی رہی "میں نے اُسے مار دیا ہے اپنی بہترین دوست کو.. میں سکم آف ارتھ ہوں.. میں بہت بری ہوں.. میں نہ اُسے ڈیزرو کرتی تھی اور نہ تمہیں.. میں ڈائن ہوں اُسے کھا گئی ہوں.."

"پلیز گیٹ ہولڈ آف یور سیلف عابدہ.. پلیز.. مجھے بتاؤ تو سہی کہ ہوا کیا ہے.. پلیز.."

وہ کچھ سنبھل گئی اور ہولے ہولے بولنے لگی "میں نے اُسے فون پر کہا کہ میں بہت تنہا ہوں آج کی شام تم میرے ساتھ گزارو.. اور اُسے بہت تیز بخار تھا' اُٹھ نہیں سکتی تھی بستر سے.. اور میں نے سمجھا کہ وہ مذاق کر رہی ہے یا اُس کی کوئی اور اپائنٹمنٹ ہے اور بہانے بنا رہی ہے تو میں نے بہت اسرار کیا... اُسے عجیب عجیب قسمیں دے کر مجبور کیا تو وہ بخار میں پھنکتی ہوئی آ گئی.. وہ بہت کمزور تھی اور اُس کی آنکھیں خون کی طرح سرخ ہو رہی تھیں اور میں اپنی حماقت پر بہت پچھتائی اور میں نے معافیاں مانگتے ہوئے اُسے گھر واپس چلے جانے کو کہا لیکن وہ نہیں مانی.. ہنستی رہی.. کہتی رہی کہ اب تمہیں میری دوستی کا یقین آ گیا.. گھر جا کر بھی بستر پر لیٹی رہوں گی.. تم مجھ سے باتیں کرو میرا دل لگا رہے گا.. سائیں میں نے بھی آج تک کسی سے تمہارا ذکر نہیں کیا تھا' شہلا سے بھی نہیں اور میرے دل پر بہت بوجھ تھا' میں نے اُسے تمہارے بارے میں بتایا' تفصیل سے بتایا.. سب کچھ بتایا تو وہ بہت ناراض ہوئی' مجھے لعن طعن کرنے لگی کہ عابدہ ہوش کرو وہ تم سے عمر میں کہیں بڑا ہے' عمر رسیدہ شخص ہے یہ تم کیا کر رہی ہو.. اگر خدا بخش کو علم ہو گیا تو وہ تمہارے ساتھ اُسے بھی ختم کر دے گا.. اُس نے مجھے بہت ڈانٹا سائیں کہ یہ سلسلہ فوری طور پر بند کر دو.. اور میں ہنستی رہی کہ یہ تو مرشد اور مرید کا رشتہ ہے ایک مرد اور ایک عورت کا نہیں لیکن اُس کی ناراضگی کم نہ ہوئی... وہ بہت تھوڑی دیر میرے ساتھ رہی اور پھر اُس کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی اُسے چکر آنے لگے.. میں نے بہتیرا کہا کہ میں تمہیں گھر چھوڑ آتی ہوں.. کسی ڈرائیور کو بھیج دیتی ہوں لیکن وہ کہنے لگی میں نے اپنی ماں کو یہ نہیں بتایا کہ میں تمہارے ہاں آ رہی ہوں اور تم جانتی ہو کہ وہ تمہیں پسند نہیں کرتیں اس لئے میں چلی جاؤں گی... میں اُسے رخصت کر کے واپس اپنے بیڈ روم میں آئی ہوں... ٹیلی ویژن پر خبریں دیکھی ہیں اور پھر لیٹ گئی ہوں تو فون آ گیا.." وہ پھر بے قابو ہو گئی.. دیر تک

غمزہ بلیوں کی طرح روتی رہی.. وہ اُسے دلاسے دیتا رہا مگر وہ اُن سے بے نیاز اپنے آپ میں گم روتی رہی... اور پھر تھک گئی اور چپ ہو گئی..

"پھر کیا ہوا عابدہ؟" وہ چاہتا تھا کہ اُس کے بدن میں اُبلتا اُبال دیگچی کے کناروں سے باہر آ کر ٹھنڈا ہو جائے اور وہ بہتر محسوس کرنے لگے..

"تم سننا چاہتے ہو؟"

"ہاں..." اُس نے چونگا دوسرے کان سے لگا لیا "ہاں میں سننا چاہتا ہوں"

"فون جناح ہاسپٹل سے آیا تھا.. کہ میرے گھر سے نکلتے ہی اُس کی کار کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا ایک واٹر ٹینکر کے ساتھ اور وہ بری طرح کچلی گئی تھی.. اور بار بار میرا نام لے رہی تھی.. اور خاور جب میں وہاں پہنچی ہوں تو وہ اکڑی ہوئی تھی اور اُس کا کچلا ہوا چہرہ پہچانا نہیں جاتا تھا.. صرف اُس کے ڈائمنڈ کے بُندے تھے جو خون آلود کانوں میں چمکتے تھے.. تم سن رہے ہو خاور... وہ اکڑی ہوئی تھی ایک لاش کی طرح.. بلکہ وہ ایک لاش بن چکی تھی میرے پہنچنے سے پہلے مر چکی تھی... میں نے اُسے اپنے ساتھ لپٹا کر بہت پیار کیا تو وہ بہت سرد بہت ٹھنڈی تھی جیسے ڈیپ فریزر میں رکھی سبزیاں ہوتی ہیں.. شی واز ڈیڈ... یہ میرا قصور ہے خاور کہ وہ اب ڈیپ فریزر میں رکھی ہوئی سبزی کی طرح سرد ہو گئی ہے..."

"تم اب آرام کرو عابدہ.. کوشش کرو سونے کی.. سلیپنگ پلز لے لو..."

"میرے ماتھے پر ابھی تک اُس کا خون ہے سائیں جب میں نے اُسے اپنے ساتھ لپٹایا تھا اور جہاں اُس کے گال تھے اُس خون کی دلدل کو چوما تھا.. میں نے اُسے مار ڈالا ہے سائیں.." اُس کی آواز بیٹھتی جاتی تھی اور اُسے بولنے میں دقت ہو رہی تھی..

"ہمیں کسی بھی تعین پہ اختیار نہیں عابدہ..." ایک عرصے کے بعد اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے آشنا ہوئیں "ہم بے بس ہیں اُس کی رضا کے آگے.. اُس کی مرضی کے آگے سر جھکانا پڑتا ہے.. نہ جھکائیں تو اور کیا کریں.. تم آرام کرنے کی کوشش کرو.. پلیز.. میرے لئے.. تمہیں پتہ ہے ناں کہ مجھے بھی تمہاری بہت ضرورت ہے.. پلیز.."

"میں کل اُس کے جنازے پر نہیں جا سکتی سائیں..." اُس کی ہچکیاں تھمنے میں نہ آتی تھیں..

"نہ جاؤ.. بالکل نہ جاؤ.. تم اپنے آپ کو بیمار کر لو گی.. آرام کرو..."

خاور نے فون رکھا تو اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھاریں بہہ نکلیں..

کشتی تھمی ہوئی لگتی تھی.. سناٹے کے سحر کی گرفت میں تھی لیکن آس پاس کے سروٹ پیچھے رہتے جاتے تھے..

"تم اپنے لئے کونسا سینٹ یا یوڈی کلون استعمال کرتے ہو؟" اُس نے ایک مرتبہ پوچھا تھا..

"میں نے آج تک سوائے آفٹر شیو لوشن کے.. کبھی کچھ بھی استعمال نہیں کیا.... میں ان چیزوں کا شوقین نہیں ہوں"

"ہوں... تمہیں ضرورت بھی نہیں.. تمہارے جسم میں جو مہک ہے وہ کسی بھی فرنچ پرفیومری میں مینوفیکچر نہیں ہو سکتی..."

اگلے روز ایک بڑا پارسل اُس کے دروازے کی چوکھٹ پر پڑا تھا اور اُس میں ڈھیروں نہایت قیمتی یوڈی کولون اور آفٹر شیو تھے.. کول واٹرز.. جاز اور پتہ نہیں کیا کیا.. سینٹ مائیکل کی بنیانیں اور انڈرویئر تھے..

سروٹوں کے ذخیرے میں سے ابھی تک کسی پرندے کی کوک سنائی نہیں دی تھی مگر اُس لمحے کشتی کے اُوپر سے چار مرغابیاں اپنے پروں کی شور سناتی گزر گئیں.. حالانکہ چار مرغابیوں کا خوشی سے کوئی تعلق نہ تھا..

"ہیلو..."

"جی..."

"سائیں ہم حاضر ہو گئے ہیں... اذن باریابی کب ہو گا؟"

وہ پھر اسلام آباد میں تھی..

وہ شہر بے مراد اپنی مردنی اور بے نوری میں گم تھا.. فیڈرل لاج کی فیملی سویٹ نمبر 19 کی کھڑکی پر وہ مردنی دستک دیتی تھی اور اُس کے اندر گھٹے گہرے اور دھنستے ہوئے

صوفوں پر وہ آمنے سامنے بیٹھے تھے..

وہ پہلے سے کہیں زیادہ دبلی اور بیمار سی لگ رہی تھی.. شہلا آفریدی کی موت نے اُسے نڈھال کر دیا تھا.. اُس کی شلوار تلے جو گھٹنے تھے ان کی چوکور بناوٹ اُبھری ہوئی تھی اور اُس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے تھے..

اُس کی بیٹی قالین پر آلتی پالتی مارے' اپنی ٹھوڑی کو بند مٹھی سے سہارتی ٹیلیویژن پر تیزی سے حرکت کرتے کارٹون پروگرام میں بظاہر کھوئی ہوئی تھی..

اُسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ گفتگو کا آغاز کیسے کرے.. عابدہ بھی خاموش بیٹھی ایک نظر اُس پر ڈالتی تھی اور پھر چھت کو گھورنے لگتی تھی..

یکدم... ایک کھٹاک کے ساتھ کھڑکیوں پر مردنی کی بجائے تیز ہوا دستکیں دینے لگی... پھر مرگلہ کی رات میں روپوش پہاڑیوں کے اندھیرے میں سے گھنے سیاہ بادل اُترے اور اُن کے ساتھ ہی زمین اور چھتوں میں چھید کر دینے والی تیکھی تیز بارش اُتری اور کھڑکیوں کے شیشے اُس کی کسیلی بوندوں کی بوچھاڑ کی زد میں آکر ٹوٹنے کو آئے.. اُس کی مٹھیاں بھنچنے لگیں اور اکہرا بدن بے اختیار کانپنے لگا اور وہ خوفزدہ نظروں سے اُسے دیکھنے لگی جیسے اُس کی مدد کی خواستگار ہو... اُس کے ہونٹ نیلے پڑتے جاتے تھے..

بالآخر وہ بے حد سہمی ہوئی اپنے آپ میں سمٹتی جیسے برفباری میں ایک سُوتی شلوار قمیض میں.... گھر سے باہر نکل آئی ہو وہ اُٹھ کر اُس کے پاس آگئی "مجھے ڈر لگ رہا ہے خاور..."

"موی... کین آئی گو ٹو بیڈ ناؤ..." بیٹی نے ریموٹ کا بٹن دبا کر سکرین پر حرکت کرتے غل مچاتے کارٹون خاموش کر دیئے..

"موی ول ٹیک یو ٹو بیڈ سویٹی..." وہ پلٹ کر اُس کی جانب ایک ماں کی والہانہ شفقت سے لپکی' اُسے اُٹھایا' چوما اور اپنی چھاتی سے لپٹا کر ڈرائنگ رُوم سے ملحقہ بیڈ روم میں چلی گئی.. جب وہ واپس آئی تو پھر اُسی سلک گاؤن میں تھی جو اُس کے ناتواں گھٹنوں سے اوپر ہی اوپر دم توڑ دیتا تھا... اور اُس کے نیچے عیب برہنگی کے سوا کچھ نہ تھا.. وہ اُس کی نہیں سرمد کی مرید تھی..

باہر فیڈرل لاج کے درختوں کی ٹہنیاں پانیوں کی بوچھاڑ سے ٹوٹتی تھیں اور بارش کا اندھا دُھند شور کھڑکیوں کے بند شیشوں پر دستکیں دیتا' اجازت بنا سیدھا اندر آتا تھا اور

کانوں کو بہرا کرتا تھا..

صرف ایک دراز قد لیمپ کونے میں ایک پہرے دار کی طرح کھڑا تھا جس کی روشنی بلند دیواروں سے لگ کر چھت تک پہنچنے کی کوشش کرتی تھی..

وہ ایک رنجیدہ اور سوگ کی حالت میں پھر اُس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی.. اُس نے اپنی ایک ٹانگ کو دوہرا کر کے دوسری پر رکھا تو گاؤن گھٹنوں سے کھسک کر اُس کے کولہوں تک سرک گیا..

"سائیں آپ ازل سے میرے رازدان ہیں.. جب تمہیں پڑھتے تھے تو تمہارے حرف ہم سے باتیں کرتے تھے اور ہم اُنہیں اپنا رازِ دل بیان کرتے تھے.. تمہیں دیکھتے تھے تو تمہاری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر تم سے اپنے دُکھ درد کہتے تھے.. بالکل اسی طرح.. جس طرح تم سے فون پر باتیں ہوتی ہیں.. ہمارے تو تصور میں بھی نہ تھا کہ کوئی ایسی رات بھی ہو گی جب آپ سچ مچ ہمارے سامنے بیٹھے ہوں گے.... تم تو نہیں دیکھتے تھے صرف ہم دیکھتے تھے.. تم بھی تو دیکھو سائیں.." اس نے اپنے کندھوں سے گاؤن ڈھلکایا اور پھر اُس کی جانب پیٹھ کر کے کھڑی ہو گئی.. گاؤن اُس کے پاؤں کے گرد ڈھیر ہو گیا "دیکھو..."

اُس کی ریڑھ کی ہڈی کے مہرے نمایاں تھے اور گنے جا سکتے تھے اور اُن کے گرد اُس کی پشت پر عجیب مشکوک سے دھبے تھے جیسے کسی جلدی بیماری کے آثار ہوں.

"دیکھو سائیں.." اُس نے پیچھے نہیں دیکھا.. اُس کی جانب پشت کیے کھڑی رہی اور پھر قدموں میں ڈھیر شدہ گاؤن میں سے پاؤں نکال کر پلٹی اور اُس کے روبرو ہو گئی..

اُس کے سارے بدن پر.. ٹانگوں پر... چھاتیوں پر.. ہر جگہ وہی دھبے نظر آ رہے تھے.. جیسے زخم مندمل ہو رہا ہو تو اُس پر کھرینڈ نمودار ہونے لگتا ہے.. ایسے دھبے..

وہ ایک اناڑی طبیب کی طرح سر سے پاؤں تک اُس کا معائنہ کرتا رہا..

"تم جو دیکھ رہے ہو تمہیں اس پر یقین کرنا پڑے گا.. کہ نہیں" وہ ہنسنے لگی.. اُس کے برہنہ ہونے میں خاور کو کوئی عیب نہ لگا کیونکہ اُس کا بدن ایک بچی کی طرح دُبلا اور کچا تھا... اُس میں کوئی ہیجان نہ تھا.. "کرامویل ہاسپٹل کا ڈاکٹر اینڈریو کینیڈی.. آئرش نیلی آنکھوں والا.. ایم ڈی... خاص طور پر لنڈن سے فلائی کر کے صرف میرے لئے دو گھنٹوں کے لئے کراچی آیا تھا... اینڈ..." وہ اپنے اکہرے بدن کو ذرا چھپاتے ہوئے شرمندہ ہو گئی"

اینڈ ڈویُو نو ویٹ ہی اِز اِن لَو وِد می۔۔ہاں۔۔ڈیئر اینڈریو بہت ہی جینئس اور معروف ڈاکٹر ہے اور کسی پریذیڈنٹ یا پرائم منسٹر کے لئے بھی ملک سے باہر نہیں جاتا۔۔ اور وہ میرے لئے آگیا۔۔ اگرچہ اُس کی فیس کا کچھ حساب نہیں۔۔ بس ہم جتنے بھی سانس لیتے ہیں اتنے سو پاؤنڈ اُس کی کنسلٹیشن کے ہوتے ہیں۔۔۔ پھر بھی وہ صرف میرے لئے آگیا۔۔ امریکہ میں جو تازہ ترین تحقیق ہوئی ہے اینڈریو سمجھتا ہے کہ اُس میں کوئی اُمید ہے اور اُس نے اُس کے مطابق مجھے کچھ میڈیسن دی ہیں۔۔۔" وہ جھکی اور اپنے ہینڈ بیگ کو اُٹھا کر اُس کے اندر ٹٹولتی ہوئی۔۔ اس میں سے چند گولیاں اور کیپسول نکال کر اُنہیں اپنی ہتھیلی پر رکھا اور پھر اُنہیں پانی کے بغیر پھانک کر نگل لیا۔۔ اور پھر سیدھی ہو گئی "یہ سب کچھ ایک تاخیری حربہ ہیں۔۔ یہ مجھے بچا نہیں سکتیں۔۔ اور میں جانتی ہوں کہ میں مر رہی ہوں۔۔"

ویت نام جنگ کی سب سے مشہور اور اثر انگیز۔۔۔ اس جنگ کی تباہ کاریوں پر لکھی جانے والی تمام کتابوں پر بھاری۔۔۔ تمامتر تجزیوں کی نفی کرتی ہوئی۔۔ ایک تصویر تھی۔۔

ایک ویت نامی بچی۔۔۔ امریکی نیپام بموں کے بھڑکتے شعلوں اور آتش برساتے پس منظر میں سے۔۔ دھماکوں اور اپنے جھونپڑے کی بربادی کے شاک میں منہ کھولے روتی ہوئی' بالکل ننگی بھاگتی ہوئی آرہی ہے۔۔

عابدہ سومرو بھی۔۔۔ اُس ویت نامی بچی کی طرح کانپتی۔۔۔ اپنی موت کے خوف سے روتی۔۔ اُس کے سامنے ننگی کھڑی تھی۔۔

اُس کا اُبھرا نا پختہ۔۔۔ بے ہیجان بدن بھی ایک بچی کا تھا۔۔ خوفزدہ اور ہراساں۔۔ صرف اُس کے پس منظر میں نیپام کی آگ نہ تھی' ایک کھڑکی تھی جس کے شیشوں پر مینہ کی منہ زور بوندیں برستی تھیں اور دستکیں دیتی تھیں۔۔

کشتی اگرچہ ٹھہری ہوئی ایک انجانے سکوت کی گرفت میں لگتی تھی لیکن سطحِ آب پر خاموشی سے کھسکتی رواں تھی۔۔

وہ آخرکار تنگ آبی گزرگاہ سے باہر آئی۔۔ اُس نہر کے اختتام تک آگئی جس کے دونوں کناروں پر سروٹوں کے جو ذخیرے تھے اُن میں قیام کرتے پرندوں نے تہیہ کر رکھا تھا کہ جب تک وہ وہاں سے گزرتی ہے وہ چونچیں نہیں کھولیں گے۔۔۔ اور جھینگر بھی جان بوجھ

کر نڑ آنے سے باز رہے تھے..

اور پھر وہ تنگ آبی گزرگاہ میں سے نکل کر سندھ کے لشکیلے.. کراں تا بہ کراں.. پھیلے ہوئے.. گنگ کر دینے والی وسعت کے حامل چوڑے دھارے میں داخل ہو گئی..

یہ دریا نہ تھا.. ایک بے انت پانیوں کا پھیلاؤ اُفق تک جاتا تھا.. کرۂ ارض پر زمین کا کوئی وجود نہ تھا' صرف پانی تھے... ایک سمندر تھا..

اس کا کنارا... تمنا کے دوسرے قدم کی طرح کہاں تھا..

کشتی جو کناروں کے درمیان رواں ہونے کی عادی تھی اُس میں داخل ہوئی تو جھجک گئی اور اُس کے درمیان میں جا کر اپنی قسمت آزمانے کی بجائے کنارے کے ساتھ لگ لگ کر چلنے لگی..

فہیم کسل مندی سے بیدار ہوا.. ایک انگڑائی لے کر اُٹھا اور کسی سے کچھ کہے سنے بغیر اپنی ٹیوب کو سینے سے لگا کر دریا میں کود گیا..

ایک غڑاپ کی سی آواز آئی اور وہ پانیوں میں گم ہو گیا اور پھر تھوڑی دیر بعد کشتی سے کچھ فاصلے پر دریا میں سے اُبھرا اور تیرتا ہوا دور ہونے لگا..

خاور جو کشتی کی نوک پر بُت بنا کھڑا تھا.. اور یکدم نہر میں سے باہر آ کر سامنے کے وسیع آبی پھیلاؤ کی حیرانی میں تھا... اس غڑاپ کی آواز پر پلٹا اور جعفر کی جانب سوالیہ نگاہیں کیں..

"سائیں حوصلہ رکھو..." جعفر کو کشتی کو کنارے کے ساتھ ساتھ رکھنے میں بہت زور لگانا پڑ رہا تھا "فہیم اپنے گاؤں کو جاتا ہے.. آپ کے لئے دیسی مرغی اور انڈے لانے کے لئے... پڑاؤ کرنے تک لوٹ آئے گا"

سندھ کا پاٹ اتنا وسیع تھا کہ دور دور تک کسی کنارے کسی آبادی کا نشان نہ تھا.. اور فہیم.. تکا مکان کے صحرا ایسی آبی وسعت میں ایک ٹیوب کے سہارے تیرتا دور ہوتا چلا جاتا تھا..

اُسے شہر میں دیر ہو گئی تھی..

اگرچہ تقریب کے بعد ایک نہایت پر تکلف ڈنر کا اہتمام تھا اور وہ دیکھ سکتا تھا کہ

اُس کی بے حد مرغوب غذائیں ٹیبل پر سج رہی ہیں.. لیکن وہ سب کی سب بھاری، چربی والی اور تلی ہوئی تھیں.. اُس کی بھوک کو اُن کی بال کے اندر آتی اشتہا انگیز مہک بہت بے چین کرتی تھی لیکن اُس نے اپنے آپ پر جبر کیا.. اُسے سختی سے ان چیزوں کی مناہی تھی.. اُس کے خون میں چربیلے مادے گھنے ہو رہے تھے اور وہ کہیں نہ کہیں کسی وقت بھی رکاوٹ ڈال سکتے تھے.. زندگی کو ہلاک کر سکتے تھے اس لئے اُسے منع کر دیا گیا تھا..

میزبانوں نے بہت اصرار کیا صرف چند لقمے لے لینے پر اصرار کیا لیکن وہ جانتا تھا اپنے آپ کو جانتا تھا کہ اگر ایک بار اُس نے ہاتھ میں پلیٹ پکڑ لی تو پھر وہ ہر قسم کی احتیاط تیاگ دے گا اور چند لقموں تک محدود نہیں رہے گا اس لئے اُس نے معذرت کر لی... گھر میں کچھ عزیز متوقع ہیں، دراصل میری بیٹی کے سسرال.. اور کھانا مجھے اُن کے ہمراہ کھانا ہے بلکہ فوری طور پر واپس جا کر بندوبست کرنا ہے..

مونگیا رنگ کے پھاٹک کے قریب پہنچ کر وہ جونہی بریک لگاتا تھا تو بشیر اگرچہ نظر نہیں آتا تھا لیکن پھاٹک فوری طور پر کھلتا جاتا تھا... اُسے ہارن دینے کی ضرورت کم ہی پیش آتی تھی لیکن آج وہ منتظر رہا.. پھر متعدد بار ہارن دیئے.. بالآخر اُسے کار سے اُترنا پڑا.. اُسے یقین تھا کہ بشیر اپنی نئی بیوی میں محو ہو گیا ہے اور کسی ایسے مقام پر ہے جہاں انسان کچھ نہیں سن سکتا.. اُس نے متعدد بار گھنٹی پر دباؤ ڈالا اور پھر بھی بہت دیر بعد بشیر برآمد ہوا.. اُس نے خاموشی سے پھاٹک کھولا اور پھر اُس کے ساتھ معمول کی گفتگو کرنے یا اُس دن کی رپورٹ پیش کرنے کی بجائے کہ صاحب فلاں فلاں نے فون کیا تھا.. فلاں ملنے آئے تھے اور رات کے کھانے کے لئے میں نے یہ کچھ تیار کیا ہے اور آپ کھانا کتنے بجے کھائیں گے.. وہ کچھ کہے بغیر اپنے کوارٹر کی جانب جانے لگا..

"بشیر.."

"جی صاحب.."

وہ ڈرائنگ رُوم میں داخل ہوا تو بشیر اُس کے پیچھے پیچھے چلا آیا..

"تم کہاں تھے؟"

"کہیں بھی نہیں صاحب.. بس..."

"اپنے کوارٹر میں تھے.. بیگم کے پاس؟" اُسے غصہ آ رہا تھا کیونکہ بشیر کبھی بھی اتنا

رُوکھا اور لاپرواہ نہیں ہوا تھا..

''نہیں جی.. اِدھر ڈرائنگ رُوم میں تھا اور... فون سن رہا تھا..''

خاور نے اُس لمحے اپنے غصے میں سے باہر آ کر بشیر پر نگاہ کی.. اُس کا سر جھکا ہوا تھا اور وہ رو رہا تھا اور اپنی ہچکیوں کو دبانے کی کوشش میں تھا..

''کیا ہوا ہے؟..'' وہ فوراً اُسکے قریب ہوا اور اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر فکر مندی سے پوچھا.. بشیر جیسا بھی تھا ایک ہمدرد اور غمخوار انسان تھا.. اور ایک مدت سے اُس کی ملازمت میں تھا..

''کچھ نہیں صاحب...'' اُس نے ایک اور ہچکی لی اور رومال سے تادیر اپنی ناک صاف کی..

''کس کا فون تھا؟'' یہ پوچھتے ہوئے غیر ارادی طور پر اُس کی نگاہ نے اُس تپائی کی جانب سفر کیا جس پر فون رکھا ہوا تھا.. چونگا کریڈل پر نہ تھا.. اپنے دونوں منہ چھت کی جانب کیئے چت پڑا تھا..

''ہیلو..'' اُس نے چونگا اُٹھا کر آہستہ سے کہا..

''یہ تم ہو سائیں... میں بشیر سے باتیں کر رہی تھی.. تم گھر پر نہیں تھے تو میں اُس سے باتیں کرتی رہی..

تم آرام کرو سائیں ابھی ابھی لوٹے ہو.. میں دوبارہ کروں گی..''

بشیر ابھی تک سر جھکائے اپنے آنسو پونچھ رہا تھا.. خاور نے پہلے تو سوچا کہ وہ اُس سے دریافت کرے کہ وہ کیا باتیں کر رہی تھی پھر اُس نے اپنے ایک ملازم کو اپنی اس خلوت میں داخل کرنا مناسب نہ سمجھا ''کھانا ابھی لگا دو.. جو کچھ بھی ہے..''

بشیر فوری طور پر کچن میں جانے کی بجائے کھڑا رہا.. اور پھر نہایت غمناک لہجے میں بولا.. کم پڑھے لکھے لوگ اپنے جذبات پر قابو رکھ کر دوسروں کو بیوقوف بنانے کا گر نہیں جانتے اور جو کچھ وہ محسوس کرتے ہیں اُن کے چہروں پر عیاں ہوتا ہے.. اور اُس کے چہرے پر کسی حد تک ایک ناپسندیدگی تھی ''صاحب آپ ان بی بی جی کا کچھ کر لیں... بہت برے نصیب والی ہیں.. بہت دُکھی ہیں..''

خاور کے ماتھے کی شکنیں گہری ہونے لگیں.. اُس نے پتہ نہیں کیا کیا اس بشیر سے

کہا تھا کیا تھیٹر لگایا تھا.. اسی لئے وہ آبدیدہ تھا.. اُس نے عابدہ سومرو کو اس لمحے سخت ناپسند کیا جس نے اُسے ایک ملازم کے سامنے کٹہرے میں کھڑا کر دیا تھا..

"اگر اُس نے میرے لئے فون کیا تھا تو تم نے صرف یہ کہنے کے سوا کہ میں فی الحال گھر پر نہیں ہوں اور اپنا نام بتا دیں.. اس کے سوا تم نے گفتگو کو آگے کیوں بڑھایا.."

"وہ ہمیشہ مجھ سے باتیں کرتی ہیں جی.."

"ہمیشہ.."

"اُنہیں پتہ ہوتا ہے جب آپ گھر پر نہیں ہوتے تو وہ مجھ سے باتیں کرنے کے لئے فون کرتی ہیں.. صاحب وہ بہت نیک دل بی بی ہیں اور آپ اُن کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کر رہے.. بہت دکھی عورت ہیں صاحب جی.. اُن کا خاوند اُن کو لنڈن کے ہسپتال میں دیکھنے تک نہیں آیا.. اُن کی سہیلی فوت ہو گئیں صاحب جی.." بشیر کے آنسو پھر اُبل پڑے.. "اور وہ مر رہی ہیں جی.. آپ اُن کا کچھ کر لیں.. شریفاں خاتون بھی ان کے لئے روتی رہتی ہے اُن کی زندگی کی دعائیں کرتی رہتی ہے.. وہ تو میرے ساتھ بھی میل ملاپ کے قصے بھول گئی ہے اُن کے دُکھڑے سن سن کر..."

"وہ.. تمہاری بیوی کے ساتھ بھی باتیں کرتی رہتی ہے؟"

"جی صاحب جی.. ایک عورت کا دُکھ تو ایک عورت ہی سمجھ سکتی ہے ناں.. وہ کہتی تھی تم میری طرف سے صاحب جی کی منت کرو کہ وہ بی بی کو بچا لیں.. میں کھانا لگاتا ہوں جی.."

اُس نے کھانے کو ہاتھ تک نہ لگایا.. دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتا رہا.. یہ عجیب سی صورتِ حال تھی.. عابدہ سومرو کیا کر رہی تھی.. کیوں ایسا کر رہی تھی.. اُس کی ذاتی زندگی میں کواڑ کھول کر بشیر کو... حتیٰ کہ اُس کی بیوی کو.. جس کی شکل بھی اُس نے مشکل سے دیکھی ہو گی.. کیوں داخل کر رہی تھی.. پاگل خانہ بالکل پوشیدہ تھی اُسے اُس کا نام بھی معلوم نہ تھا اور عابدہ بالکل برہنہ تھی اُسے ہر کوئی دیکھ سکتا تھا.. اُس کے ملازم بھی..

حسبِ معمول گئی رات ٹیلی فون کی گھنٹی بلند ہوئی اور وہ منتظر تھا..

"ہیلو.." بھاری کراہتی ہوئی آواز.. جس کا وہ منتظر تھا..

وہ برس پڑا...

"سنو تو سہی سائیں.. ہماری بھی تو سنو.." اُس کی آواز میں اُس کے برسنے سے.. اُس کی شدید ناراضگی اور غصے سے کوئی ہلچل نہ ہوئی.. کوئی تموج نہ آیا.. وہ دھیرج میں ہی رہی.. ہمیشہ کی طرح ایک پتے تلے ٹھہراؤ میں ہی بولتی رہی "سائیں ہم کیا کریں.. آپ گھر میں نہ ہوں تو ہم کیا کریں.. یونہی اپنے کمرے کی قید میں مرتے رہیں.. کچھ بھڑاس نکال لیتے ہیں صرف اس لئے کہ غالب ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست... ہم تو بوئے دوست سے باتیں کرتے ہیں اُن کے ساتھ تو نہیں کرتے اور آپ خواہ مخواہ جلال میں آگئے.. اور سنو سائیں... مرشد کے در پر بیٹھے کتے بھی ہمیں پیارے لگتے ہیں... صرف اس لئے کہ وہ در پر بیٹھے ہیں.. نصیب والے ہیں اور ہم اُس در سے دور ہیں.. دھتکارے ہوئے ہیں.. تو کتوں سے باتیں کرنے پر آپ خفا ہوتے ہیں تو آئندہ نہیں کریں گے.."

اُس کا کھولتا ہوا غصہ جو بدن کی دیگچی کے کناروں سے اُبل کر باہر آرہا تھا.. ٹھنڈا ہونے لگا.. اس میں حرج کی کوئی ایسی بات نہ تھی.. اُس پر جو گزر رہی تھی.. تنہائی اور موت کے شکنجے میں وہ جو جکڑی ہوئی تھی اگر اُس نے بشیر اور اُس کی بیوی کو اس میں شریک کر لیا تھا تو قصور نہیں کیا تھا.. ڈوبتا ہوا شخص ہر تنکے کو سہارا سمجھتا ہے.. بچانے والی کشتی اگر دور ہو تو اُسے ہاتھ پاؤں مارنے سے آپ روک تو نہیں سکتے..

"تم کیسی ہو؟" اُس نے اس سوال میں اپنی معذرت اور کسی حد تک یکدم غصے سے پھٹ پڑنے کی شرمندگی کو سمو دیا..

"مرشد نے پوچھ لیا کہ تم کیسی ہو تو... ہم جی اُٹھے.. بے شک مر رہے تھے لیکن آپ کے پوچھنے سے جان واپس آگئی.. کہاں گئے تھے؟"

"ایک بے مقصد سی تقریب تھی.. جس میں جانے سے حاصل حصول کچھ نہیں ہوتا... صرف منتظمین کے بار بار فون کرنے سے.. درخواستیں کرنے سے انسان مجبور ہو کر چلا جاتا ہے تاکہ اُسے متکبر اور بد دماغ نہ سمجھا جائے.. وہیں دیر ہو گئی.."

"سائیں ایک تو آپ پرانے فیشن کے ہیں... ڈرائنگ رُوم میں تپائی پر پڑا ٹیلی فون تو اب ایک پتھر ہے.. اس میں جان نہیں ہے.. آپ موبائل کیوں نہیں رکھتے تاکہ آپ جہاں بھی ہوں ہم آپ کے سانس سن سکیں.."

"میں موبائل افورڈ نہیں کر سکتا" وہ ہنسنے لگا.. اُس کی ناراضگی اور غصہ اُس کی باتوں

کی حدت سے پگھل کر بہہ چکا تھا.. "اور یوں بھی گھر سے نکل کر میں چاہتا ہوں کہ میں ذرا لاتعلق ہو جاؤں... موبائل کی گھنٹی مجھے دنیا کی بھدی ترین آواز لگتی ہے... میرے رگ وریشہ کو ریزہ ریزہ کر دیتی ہے.."

"میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ آپ بہت بھولے ہو سائیں.. کسی اور دنیا میں دھونی رمائے بیٹھے ہو اور اُس کے باہر ایک اور دنیا ہے جہاں سے میں تمہیں فون کرتی ہوں.. بھدی آوازوں والے موبائل تو شوخے اور نو دولتیئے لوگ رکھتے ہیں دوسروں کو متاثر کرنے کے لئے.. ایسے موبائل بھی ہیں کہ سینے کے ساتھ لگائے رکھو تو ہولے ہولے دستک دیتے ہیں اور آس پاس کسی کو خبر بھی نہیں ہوتی.. میں صرف اجازت مانگتی ہوں... کل سویرے تمہاری چوکھٹ پر ایک ایسا ہی موبائل دھرا ہو گا..."

"نہیں.. مجھے واقعی اس کی ضرورت نہیں ہے.. پہلے ہی تم نے جو پرفیوم اور یوڈی کلون بھیجے ہیں وہ زندگی بھر کے لئے کافی ہیں.. تم کیسی ہو؟" اُس نے پھر پوچھا..

اُس نے جواب میں کچھ نہ کہا..

"ہیلو..." وہ لائن پر تو تھی لیکن بولتی نہ تھی "عابدہ..."

"جی سائیں.."

"تم اب کیسی ہو؟.. پہلے سے بہتر ہو؟.. شہلا کے جنازے پر تو نہیں گئی تھی؟"

"نہیں سائیں آپ نے منع کر دیا تھا تو میں نہیں گئی.." اُس نے ذرا سوچ کر رُکتے رُکتے کہا "سائیں آپ اب تو غصے میں نہیں؟.. میں ڈر گئی تھی سائیں.. آپ غصے میں نہ آیا کرو میری جان نکل جاتی ہے... سنو سائیں.. میں جو آج بار بار فون کر رہی تھی اور آپ گھر پر نہیں تھے تو میں مجبور ابشیر کے ساتھ باتیں کرتی رہی تو ایک وجہ تھی.. سائیں میں نے ایک درخواست پیش کرنی تھی.."

وہ پھر چپ ہو گئی..

"تم حکم کرو سائیں.." اُس کا وجود جو ہمیشہ برقرار رہتا ہے.. جو کبھی زوال سے آشنا نہیں ہوتا.. جس کے لب پنکھڑیوں کی طرح ہمیشہ کھلے رہتے ہیں کبھی پژمردہ نہیں ہوتے اور جس کے دانت سلامت رہتے ہیں' بدن کسا ہوا رہتا ہے اور جو کچھ آئینے میں دیکھتا ہے اس پر یقین نہیں کرتا صرف اپنے اندر سے اُٹھنے والی آتش صفت ہوک پر یقین رکھتا ہے جو کبھی

راکھ نہیں ہوتی... اُس وجود کی بولی میں وہ کھنکتا ہوا بولا "یہ تو... تو من شدی اور من تو شدی والے معاملات ہیں جن میں یہ فیصلہ نہیں ہو پاتا کہ مرشد کون ہے اور مرید کون ہے.. ہم تو اُس چھترے برساتی تیز بارش کے بھی مرید ہیں جو آپ کی کھڑکیوں کے شیشے توڑتی تھی.. اور عیب برہنگی کے بھی چاکر ہیں.. تو آپ حکم کریں سائیں.."

جواب میں جو کچھ اُس نے کہا اُسے سن کر اُس کا برقرار وجود برقرار نہ رہا.. زوال آشنا ہوا.. لب پژمردہ ہو گئے.. دانت ہلنے لگے' بدن ڈھیلا پڑ گیا اور وہ لمحہ وجود میں آگرا..

"سائیں تم میرے ساتھ وعدہ کرو کہ.. میرے مرنے کے بعد تم میری بیٹی کا خیال رکھو گے.. پلیز..."

"یار تم حوصلہ رکھو... تم اپنی اولاد کا خود خیال رکھو گی... مجھے یقین ہے"

"نہیں خاور... تم نے تو وہ دھبے دیکھے ہیں ناں میرے بدن پر.. خدا بخش نے کبھی نہیں دیکھے کیونکہ وہ ایک عرصے سے میرے نزدیک نہیں آیا.. ڈاکٹر اینڈریو نے بھی مجھے... میرے گال پر بوسہ دے کر میرے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بتایا تھا کہ.. ڈیئر گرل میں تم سے محبت کرتا ہوں.. تمہیں ایک عام مریض نہیں سمجھتا اس لئے بتا رہا ہوں کہ یہ گولیاں اور کیپسول چند دنوں کے لئے تاخیر کر سکتے ہیں لیکن انجام نہیں بدل سکتے.. تم جو کچھ طے کرنا چاہتی ہو کر لو... سائیں آپ وعدہ کرو کہ میرے بعد آپ میری بچی کا خیال رکھو گے...."

اُس کی آواز میں ایک ٹھہراؤ اور اطمینان تھا... ایک ناقابل واپسی زندگی کی حقیقت جان لینے کا اطمینان..

"آئی پرامس..."

اگلی دوپہر زیرو پوائنٹ کی دھوپ اور ویرانی میں.. جب کہ وہ تکونی لمبی دم والا کرلا منتظر تھا کہ کب چٹان کی قربت میں کھڑے یہ دو انسان غافل ہوں اور کب میں رینگتا ہوا تارکول کی سڑک کو پار کر جاؤں اُس نے پچھلی شب عابدہ کے ساتھ جو گفتگو ہوئی تھی اُس کا تفصیلی تذکرہ کیا۔

اُس کی غلافی آنکھیں پانیوں سے بھر گئیں.. چھلکنے لگیں..

وہ اپنے کالج دنوں کے زمانے سے اُس کے لئے بھڑکنے والے الاؤ کو بجھا دینے پر

پچھلی شب کی مانند ریت کا ایک چھوٹا سا کوہان پانیوں میں اُبھرا ہوا نہ تھا.. بہت وسیع تھا..

اس لئے فہیم یہاں بے خطر جھومر ڈال سکتا تھا اور وہ ڈال رہا تھا..

جعفر پانی میں لڑھک جانے کے خدشے سے بے نیاز بوٹی پی سکتا تھا اور وہ پی رہا تھا..

فہیم جھکا ہوا چہرے کو ایک جانب کئے ہوئے جیسے پیچھے مڑ کر دیکھ رہا ہو.. دونوں ہاتھ فضا میں اُٹھائے پاؤں مارتا جھومر ڈالتا تھا.. مرغابی کی موت ایڈورٹائز ہو رہی تھی..

چونکہ وہ حلال تھی اس لئے اُسے ذبح کرنے کی ضرورت پیش نہ آئی... صرف گردن کاٹ کر اُس کی بے مثال چونچ اور ابھی تک زندہ کانچ کی آنکھوں سمیت اُسے پرے پھینک دیا گیا اور پھر پروں کو نوچ کر اُسے صاف کر لیا گیا.. ان پَروں کے گچھے اور اگاد گا پَر اُس ریت پر بکھرے ہوئے تھے جس پر فہیم رقص کر رہا تھا اور اُس کے پاؤں اُن پر پڑتے تو اُن کی پرجوش زد میں آکر کوئی ایک پَر ذرا بلند ہوتا... اُس کا رنگ کچھ بھی ہو سکتا تھا.. سیاہ' بھورا' نارنجی یا چمکیلا سرمئی.. یا سفید بھی.. اور پاؤں کی دھمک سے اُٹھا پر ہوا میں کچھ دیر ٹھہرا رہتا اور الاؤ کی روشنی سے زندہ لگنے لگتا.. یہ پَر بھی ایک مرغابی تھی جو ابھی تک اُڑنے کی سعی کرتی تھی... اپنا کُل نہ سہی ایک جز سہی' پھر سے پرواز کرنے کی کوشش کرتی تھی..

خاور گھٹنوں پر سر رکھے مسحور ہوا صرف فہیم کے پاؤں کو تکتا تھا اور انتظار کرتا تھا کہ کب کوئی ایک اور پَر اُس کے تلووں کے نیچے سے جنم لینے والی ہلکی ہوا کی زد میں آکر ریت میں سے بلند ہو اور الاؤ کی روشنی میں ظاہر ہو... ڈولتا ہوا آہستہ آہستہ اوپر اُٹھتا جائے.. وہ جس نے انسان کو پانی کی ایک بوند سے تخلیق کیا تھا اور روزِ حشر اُس کی ہڈیوں کو سمیٹ کر پھر سے زندہ کر دینا تھا.. یہ بھی کر سکتا تھا کہ اس پرندے کے سارے پَر جو ریت پر بکھرے ہوئے ہیں اُنہیں بھی سمیٹ کر اُسے پھر سے بنا دے' تیار کر دے' زندہ کر دے اور اُسے اپنے آبائی گھونسلے کہیں جھیل بیکال کے سرکنڈوں میں منتظر گھونسلے کی طرف لوٹا دے..

جب تک یہ نہیں ہوتا تھا وہ فہیم کے پاؤں میں سے اُٹھنے والے ہر پَر سے وہی ایک مرغابی تخلیق کرتا تھا اور اُسے اس جزیرے کی گھنی رات میں سے بلند کر کے اُن بلندیوں پر بھیجتا تھا جہاں سے راستے سیدھے اُس کے گھونسلے کو جاتے تھے..

ایک مرغابی کا اگرچہ خوشی سے کوئی تعلق نہ تھا لیکن وہ اُس کے لئے از حد آزردہ

ہو رہا تھا.. اور یہ آزردگی کتنی جعلی اور کھوٹی تھی.. ابھی تھوڑی دیر پہلے جب اسی مرغابی کا گوشت دیسی گھی میں بھنا ہوا ہانڈی سے اُترا تھا اور اُس میں اُن اُپلوں کی بُو تھی جو پکھی کے ہاتھوں نے سلگائے تھے تو اُس نے اُسے کتنی رغبت سے کھایا تھا.. ایک ایک ہڈی چوسی تھی... کسی بھی احساس جرم کے بغیر... چنانچہ دراصل وہ خود ہی وہ شکاری تھا جس نے بنا جھجک اُسے مار گرایا تھا... اور اب خود ہی آزردہ ہوا تھا کہ اس آزردگی کے لئے حس جمال ایک بہانہ تھی ورنہ زبان کے ذائقے نے تمام جمالی اخلاقیات کو... کسی بھی احساس جرم کے بغیر تہہ تیغ کر دیا تھا..

اور اب وہ شرمندہ محسوس کر رہا تھا.. قتل کرنے کے بعد شرمندگی کی آڑ میں اُلٹا ثواب لے رہا تھا..

اس احساس میں کہیں بھی یہ ضمانت نہیں تھی کہ اگر کل رات بھی اُس کے سامنے دیسی گھی میں بھنی ہوئی ایک اور مرغابی ہانڈی سے اُترتی ہے تو وہ اُسے کھانے سے پرہیز کرے گا.. وہ اپنی خصلت کو تبدیل نہیں کر سکتا تھا اور اُسی خصلت میں جو آزردگی تھی وہ بھی اُس کے بس سے باہر تھی..

جہاں کشتی بندھی تھی.. دونوں خیمے تاریکی میں تھے' چولہا جلا تھا اور مرغابی کے پروں کے گچھے کچھ ریت پر پڑے تھے اور کچھ فہیم کے رقص کرتے پاؤں کے طفیل ہوا میں بلند ہو کر سندھ کے سیاہ پانیوں میں جا اُترے تھے اور اُن پر بہتے ہوئے جانے کہاں تک چلے گئے تھے.. دریا کا ایک بہت چوڑا میدان نما ریتلا کنارا تھا.. بہت دور جا کر یکدم اونچا ہوتا تھا اور وہاں سے سروٹوں کے ذخیرے کا آغاز ہو جاتا تھا..

فہیم حسب معمول جھومر ڈالنے کا فرض ادا کر کے ہانپتا ہوا بیٹھ گیا..

"میں اپنے گاؤں سے ہو کر آیا ہوں سائیں.. پورے گاؤں میں گھوم گیا پر ایک مرغی بھی نہ ملی.. انڈوں والی مرغیاں لوگ فروخت نہیں کرتے.. پھر میں نے سوچا کہ کیوں نہ غلام محمد شمر سے پتہ کروں اُسکے پاس تو دنیا جہان کی مرغیاں جمع ہوتی ہیں... خود نہیں پالتا سائیں.. آس پاس کے گاؤں سے' کھیتوں سے پکڑ لاتا ہے' کہتا ہے کہ آوارہ مرغیاں تھیں... تو آج اُس کا صحن بھی خالی تھا.. واپسی پر دریا میں ٹہلتا آ رہا تھا تو سوہنے رب نے یہ تحفہ تیرتا بھیج دیا..."

"عجیب سا نام ہے غلام محمد شمر..."

تیار ہو گئی.. پچھلی شب کی درخواست سننے کے بعد وہ عابدہ سومرو کے حق میں دستبردار ہونے کو... اپنی رضا سے اور خوشی سے تیار ہو گئی..

"تم نے اُس کے آخری دنوں میں.. جیسے بھی ہو خوش رکھنا ہے.. اُسے دُکھ نہیں دینا اُس کا خیال رکھنا ہے.. اُس کی بچی کو سنبھالنا ہے.." اور اُس کی غلافی آنکھوں میں پانیوں کا اتنا ذخیرہ کبھی نہ تھا جو اُمڈتا ہوا.. ایک سیلاب کی صورت اُس کے گالوں پر ایک ندی کی طرح بہتا تھا.. پاگل خانے کی نظروں میں.. بشیر اور اُس کی شریفاں خاتون کی نگاہوں میں وہ مجرم ٹھہر گیا تھا.. اُس کے خلاف ایک جذباتی بغاوت ہو چکی تھی کہ وہ کیوں اِس دُکھیا اور قریب المرگ عورت کے لئے کچھ نہیں کرتا.. اُس کے لئے دوا کیوں نہیں ہوتا..

لیکن دوا کیا تھی؟..

ڈھلتی دھوپ میں سندھ پارے کا ایک سمندر تھا.. آنکھ اُس پر ٹھہرتی نہ تھی..

جیسے کسی تیل بردار جہاز میں شگاف پڑنے سے پٹرول بہہ نکلے اور دور دور تک سمندر کی سطح پر پھیل جائے اور پھر کوئی ماچس کی ایک جلتی ہوئی تیلی اُس پر پھینک دے اور وہ بھڑک اُٹھے... ایسے سندھ کے پانی ڈھلتی دھوپ میں لشکتے تھے کہ اُن پر آنکھ نہ ٹھہرتی تھی..

اور اس سیماب صفت چمک کو چیرتی اُن کی کشتی تھی..

اور اس تھرتھراتی لشکتی وسیع پارہ چادر میں تیرتا فہیم تھا جو کشتی کے قریب ہوتا جا رہا تھا.. جیسے سیال چاندی میں ڈوبتا اُبھرتا بڑی بڑی مونچھوں والا ایک لدھر ہو..

وہ جعفر کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام کر عرشے پر آگرا اور اُس کے بدن سے نچڑتا پانی کشتی کے تختوں میں جذب نہیں ہوا بلکہ سطح پر ٹھہر گیا اور وُہ بھی جھلملانے لگا.. جیسے وہ اپنا پارہ سا تھ لے آیا ہو.. تھوڑی دیر اُسی حالت میں پڑا فہیم ہانپتا رہا کپکپاتا رہا اور وہ جو اسے دیکھتے تھے اُنہیں دیکھ دیکھ کر مسکراتا رہا اور پھر اپنے سر کے بالوں کو یوں جھٹکا جیسے ایک کتا اتفاقاً پانی میں جا گرے تو وہ باہر نکلتے ہی پہلا کام یہ کرتا ہے کہ اپنے بدن کو خشک کرنے کی خاطر اُسے خوب جھٹکتا ہے..

"دیسی مرغی تو نہیں مل سکی سائیں.. پر اُس سے بہتر شے مل گئی ہے.." اُس نے کندھوں پر بندھی نچڑتی ہوئی پوٹلی اُتار کر اُس کی گانٹھ کو مشکل سے کھولا.. انگلیوں سے نہیں

کھلی تو دانتوں سے کھولا... اُس میں ایک مرغابی تھی.. گردن ڈھلکی ہوئی تھی' چونچ سے پانی بہہ رہا تھا اور اُس کی پر کشش آنکھیں زندہ اور کھلی تھیں.. "مرغی نہیں ملی ناں تو مایوس واپس آرہا تھا.. تو میں تیرتا ہوں تو یہ میرے آگے سے بہتی ہوئی جارہی ہے.. میں نے تھوڑا پیچھا کر کے اسے پکڑ لیا.. کسی شکاری کے فائر سے زخمی ہو کر گری ہے تو سندھ پر گری ہے اور وہ اسے نکال نہیں سکا اور یہ بہاؤ کے اندر آکر اُس کی پہنچ سے دور ہو گئی ہے.. دیکھیں.." اُس نے مرغابی اُٹھا کر اُس کا ایک تیز دھڑکتے رنگوں والا پر چٹکی میں لے کر اونچا کیا "اِدھر... اُڑتے ہوئے پر کے نیچے چھرے نے مار کی ہے... حلال ہے سائیں' شکاری پڑھ کر فائر کرتے ہیں... ہاتھ لگا کر دیکھیں ابھی گوشت میں گرمی ہے.."

خاور نے ہاتھ بڑھا کر اُسے محسوس کیا.. پر کے نیچے.. ابھی تک زندگی کی کچھ حرارت باقی تھی اگرچہ زندگی رخصت ہو چکی تھی اور یہ حرارت اُس کی اُنگلیوں کی پوروں کے راستے سارے بدن میں پھیلتی گئی اور ایک شاہکار پرندے کی مرگ پر ماتم کرتی گئی.. اُس کے چپو نما پنجے حیرت انگیز طور پر کسی کھلونے کے لگتے تھے' ربڑ کے بنے ہوئے لگتے تھے... چونچ پلاسٹک کی لگتی تھی.. البتہ کھلی آنکھوں میں کوئی شک نہ تھا اُنہیں کوئی کاریگر نہ بنا سکتا تھا.. وہ زندہ اور دیکھتی تھیں..

انسان اپنی متوقع موت کو کتنا مشتہر کرتا ہے.. اپنے آپ کو اور دوسروں کو رُلاتا ہے کہ... اوڑک جاناں مروے چل میلے نوں چلے... لیکن اپنے سے کہیں بڑھ کر متناسب... پر کشش اور خوبصورت... اور اس دنیا میں رہ جانے کے حقدار پرندے کا نشانہ لگاتے ہوئے ذرا نہیں جھجکتا... بلکہ اُس کی مرگ پر شاداں ہوتا ہے اور فخر کرتا ہے.. اگر اس مرغابی کو پہلے سے علم ہو جاتا کہ مجھے مرنا ہے.. آج اتنے بج کر اتنے منٹ پر.. جب میرے نیچے پھیلے دریا کو دھوپ نے سفید آگ سے ڈھک رکھا ہو گا تو چند چھرے میرے دائیں پر کے نیچے میرے بدن میں داخل ہو کر میری آنکھیں پتھرا دیں گے' پنجوں کو بے جان کر دیں گے اور میں دریا کی سفید آگ میں گر کر ٹھنڈی ہو جاؤں گی تو کیا یہ مرغابی بھی رُلاتی.. اپنی متوقع موت کو مشتہر کرتی...

جزیرہ' جس پر رات آئی بہت بڑا تھا..

"ہاں سائیں.. خود بھی بہت عجیب ہے.. کہتے ہیں کہ پرانا ٹیرگی ہے.. میں بالکل نہیں سائیں.. تو میری طرح گاؤں کے سکول میں ٹیچر ہے.. کہنے لگا' مرغی تو نہیں ہے پر اُدھر سندھ سائیں میں جو مسافر دوست آئے ہیں اُنہیں ملنے میں بھی چلتا ہوں.. پر میں نہیں لایا سائیں.. شمر کا کوئی اعتبار نہیں.."

"کیوں؟"

"شمر جو ہے.. اُس میں شر بہت ہے سائیں.. مزاق میں لوگوں کا نقصان کر کے خوش ہوتا ہے.. اُدھر گاؤں میں ایک شخص نئے کوٹھے ڈالنے کے لئے چھ سات شہتیر خرید کر لایا اور گھر کے سامنے ڈال دیئے.. شمر نے وہ شہتیر دیکھے تو ترکھان کے پاس چلا گیا.. بیس روپے پیشگی ادا کئے اور کہنے لگا' بیٹے فلاں جگہ میرے شہتیر پڑے ہیں اُنہیں آری سے چھوٹی چھوٹی تختیوں میں کاٹ دو بچوں کو دینی ہیں پر یہ کام صبح نو بجے سے دو بجے تک ہو جانا چاہئے.. ترکھان نے یہ کام کر دیا۔ ڈھائی بجے وہ شخص کام سے واپس آیا تو اُس نے سر پیٹ لیا.. ہزاروں روپے کی مالیت کے شہتیر بیکار قسم کی تختیوں میں بدل چکے تھے.. اور پھر بقیہ مزدوری لینے کے لئے ترکھان بھی پہنچ گیا..."

"شمر کی بات کرتے ہو فہیم..." سرور اندھیرے میں سے باہر آکر الاؤ کی راکھ ہوتی لکڑیاں پلٹنے لگا.. اور ہنسنے لگا..

"ہاں..."

"سائیں کو وہ بتاؤ ناں کہ شمر حجام کے پاس جاتا ہے... پہلے بال کٹواتا ہے.. پھر اُن کو دھلاتا ہے پھر کہتا ہے کہ اب اُسترا پھیر کر ٹنڈ کر دو... اور جب اُٹھتا ہے تو کہتا ہے کہ میں نے تو صرف ٹنڈ کرائی ہے اور آٹھ آنے دے کر چلا جاتا ہے.."

فہیم بھی ہنسنے لگا.. اور اتنا ہنسا کہ دوہرا ہو کر گرنے کو تھا کہ پھر سنبھل گیا...

"سائیں پچھلی رات کا خدشہ ابھی تک ہے.. وہاں دوہرے ہو کر گرتے تھے تو سندھ میں جا گرتے تھے.. یہاں خیر ہے.. سائیں شمر کی کیا بات ہے.. سکول کے ہیڈ ماسٹر کے ساتھ دشمنی بنالی.. ایک مرتبہ انسپکٹر صاحب سکول کی انسپکشن کو آئے تو شمر ذرا دیر سے آیا اور آیا ہے تو سر سے پاؤں تک کیچڑ میں لت پت کلاس روم میں داخل ہوتا ہے اور کہتا ہے.. دیر سے آنے کی معافی چاہتا ہوں سرکار.. لیکن ہیڈ ماسٹر صاحب کی بیگم نے آج بھی بلا لیا تھا کہ گھر کی